ضیاء الحسن *

فیض کے اسلوب شعر کا ارتقا

فیض نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام نقش فریادی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ خالص رومانوی شاعری پر مشتمل ہے۔ اپنے دیگر سینئر اور ہم عصر شاعروں کی طرح فیض نے بھی اپنی شاعری کا آغاز رومانویت سے کیا۔ رومانویت ان کے عہد کا غالب رجحان تھی لیکن ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ان کی شاعری رومانویت سے حقیقت نگاری کے دور میں داخل ہوئی۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' مجموعے کے دوسرے حصے کی پہلی نظم ہے جو ایک طرف ان کے ابتدائی رومانوی مزاج سے وابستہ ہے اور دوسری طرف ترقی پسند حقیقت نگاری کا اظہار ہے۔ کئی نقادوں کا خیال یہ ہے کہ فیض کا فطری اسلوب رومانوی ہے جب کہ ترقی پسند اسلوب انھوں نے شعوری طور پر اختیار کیا۔ اس خیال کی وجہ دونوں اسالیب میں پایا جانے والا بعد المشرقین ہے۔ رومانوی اسلوب نرم، لطیف اور شاعرانہ ہے جب کہ حقیقت پسندی کا اظہار کھردرے غیر شاعرانہ براہِ راست اسلوب میں ہوا ہے۔ فیض کی شاعری کے بارے میں یہ نقطۂ نظر ان کی شاعری کے سرسری تجزیے سے پیدا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کے عہد میں ان کے ہم عصر ترقی پسند نقادوں نے یہ اشتباہ پیدا کیا کہ شاعری کا جمالیاتی تجربہ غیر ترقی پسندانہ ہوتا ہے اور یہ طبقۂ اشرافیہ کے ذہنی تعیش کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تخلیقی تجربے کے وجدانی عناصر کو بھی یہ ترقی پسند نقاد

غیر ترقی پسندانہ خیال کرتے تھے اور اسی نقطۂ نظر نے غزل جیسی مقبول صنفِ ادب کو رد کرنے کی ترغیب دی کہ یہ صنف بھی انھیں طبقہ اشرافیہ کے ذہنی تعیش کا ذریعہ نظر آئی۔ یہ نظریہ ترقی پسند اذہان میں کچھ ایسا راسخ ہوا کہ آج تک ان کے لاشعور سے نکل کر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ فیض صاحب فن کے اس نظریے سے متفق نہیں تھے لیکن لاشعوری طور پر وہ بھی ابتداً اس کے اسیر رہے۔ چناں چہ اس پہلی نظم سے لے کر ''ملاقات'' تک ان کے اسلوبیاتی سفر میں یہ بُعد نظر آتا ہے۔ چناں چہ یہ نظم دو واضح اسالیب میں بٹی ہوئی ہے۔ چوں کہ رومانوی تجربے کو انھوں نے تخلیقی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس لیے رومانویت بعض نقادوں کو ان کا فطری اسلوب محسوس ہوئی لیکن ان کے اسلوبیاتی ارتقا کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ نقش فریادی میں انھوں نے جہاں جہاں ترقی پسند موضوعات کو اپنی شاعری میں اختیار کیا ہے، وہاں ان کا اسلوب غیر تخلیقی، کھردرا، براہِ راست اور استعاروں سے تہی ہو گیا ہے کیوں کہ ان کے عہد کے ابتدائی ترقی پسند نقادوں نے کج فہمی میں یہ تاثر پیدا کیا کہ ترقی پسند اسلوب غیر شاعرانہ اور غیر تخلیقی ہوتا ہے۔ ابتداً فیض بھی اس سے اثر پذیر رہے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے شعوری طور پر اختیار کردہ غیر تخلیقی، غیر شاعرانہ اور استعاروں سے خالی اسلوب کو ترک کر دیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے تخلیقی تجربے کو فطری اظہار کے سپرد کر دیا۔ فیض کی شاعری کا یہ دولخت اسلوب نقشِ فریادی کی چند نظموں کے علاوہ نہیں ہے۔ اس سلسلے کی آخری نظم ''موضوعِ سخن'' ہے۔ ''موضوعِ سخن'' کے بعد فیض کی شاعری میں ایسا کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ اس لیے یہ کہنا کہ رومانویت فیض کا فطری اور ترقی پسندی غیر فطری تجربہ ہے محض سرسری بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ اپنے عہد کے نقادوں کے ''غیر ترقی پسندانہ'' ترقی پسند خیالات کے زیرِ اثر ایک مختصر دور تک وہ بھی اس ابہام کا شکار رہے کہ ترقی پسند موضوعات کا اسلوب غیر تخلیقی، غیر شاعرانہ اور براہِ راست ہوتا ہے لیکن وہ جلد ہی اس تضاد سے نکل گئے اور پہلے مجموعے کے بعد ان کی شاعری نے ان کے فطری تخلیقی اسلوب میں ہی اظہار کیا ہے۔

بعض نقادوں نے ''مجھ سے پہلی سی محبت'' والی نظم کو رومانویت سے گریز اور ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف سفر کا آغاز قرار دیا ہے، بعض دوسرے نقادوں نے اسے رومانوی حقیقت پسندی یا رومانویت اور ترقی پسندی کا امتزاج قرار دیا ہے۔ فتح محمد ملک نے اپنے مضمون ''فیض کی

دو آوازیں'' مشمولہ تعصبات میں اسے فیض کے فطری رنگ شعر اور اختیاری حقیقت پسندی کی کش مکش بنا دیا ہے۔ وہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ فیض ترقی پسند حقیقت نگاری کی طرف صاحب زادہ محمود الظفر کے ہاتھ پر ''مشرف بہ اشتراکیت'' ہونے کے بعد راغب ہوئے ورنہ ان کی اصل شاعری رومانویت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، جہاں ان کے شعری کمالات کھل کر اپنا اظہار کرتے ہیں۔(۱) فیض جیسے اہم شاعر کے بارے میں ایسی متضاد آرا کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیوں کہ جو شخص اپنے کسی کمال کے باعث لوگوں کی توجہ کا مستحق ٹھہرتا ہے، اس کے حوالے سے ایسا اختلاف رائے سامنے آسکتا ہے۔ سلیم احمد نے ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں اس نظم کے بارے میں تضحیکی انداز اپنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> فیض کی شاعری کا ''میں'' محبوبہ کو یہ مژدہ سناتا ہے کہ وہ دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام میں بہت مصروف ہے، اِس لیے اُس سے پہلی سی محبت نہیں کر سکتا اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ (مژدہ) اس نے کسی شدید جذباتی کرب کے عالم میں سنایا ہے بل کہ اس طرح جیسے کوئی کسی کو ملازمت میں تبادلے کی خبر سناتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب تبادلہ ترقی کے ساتھ ہوا ہو۔(۲)

طنزیہ اور تضحیکی انداز کے باوجود سلیم احمد کی رائے سے دو نتائج بہ آسانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ فیض نے شاعری میں ''دردمندوں اور غریبوں کی حمایت کے کام'' کا آغاز کر دیا ہے۔ گویا وہ بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اس نظم میں ترقی پسند حقیقت نگاری کا اظہار ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تبادلہ ترقی پر ہوا ہے یعنی اس نظم میں فیض کی تخلیقی شخصیت ارتقا پذیر نظر آتی ہے۔ ادب کی تفہیم و تجزیہ کا کام ہر نقاد اپنے نظریہ زندگی اور نظریہ ادب کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے ایک بات سب ہی نقادوں نے کی ہے کہ یہ نظم فیض کی شاعری میں نئی حقیقت نگاری کے آغاز کا اعلان ہے۔ اس نئی حقیقت نگاری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ذہن رکھنے والے

ادیبوں نے سوچ سمجھ کر ایک باقاعدہ منشور کے تحت کیا کہ ادب کا منصب زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک و تجزیہ اور ایک روشن مستقبل کے لیے تحرک پیدا کرنا ہے۔ یہی شعور اس نظم میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے اس امتزاجی اسلوب کو اردو شاعری میں ایک نئے طرز ادا کی دریافت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہ نظم واقعی ایک نئے احساس کی ترجمان ہے۔ اس میں ایک نیا زاویہ نظر ہے جس کی مثال اردو کی جدید شاعری میں کہیں اور نہیں ملتی۔ (۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون ''نئے شاعر — فیض'' میں لکھتے ہیں:

> فیض نے حسن و انقلاب کو ایک دوسرے میں ایسا سمو دیا ہے کہ انقلاب میں حسن اور حسن میں انقلاب کا پہلو نظر آنے لگا ہے اور یہ تحلیل اردو شاعری میں بالکل نئی ہے۔ (۴)

فیض کا امتزاجی اسلوب — صحافتی اظہار ہے اور شاعرانہ اسلوب اور تخلیقی عناصر سے بے بہرہ ہے لیکن جب فیض نظم کی بنت کے لیے نئے احساس شعر سے کام لیتے ہیں اور جمالیاتی حسن کے ساتھ ایک دھیمے دھیمے سلگتے انداز میں ترقی پسند فکر کے بلند بانگ اور طوفانی موضوعات کا اظہار کرتے ہیں تو یہی نقاد اس کے خلاف بھی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ سجاد حارث نے اپنی کتاب ادب اور ریڈیکل جدیدیت میں اس موضوع کے حوالے سے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف ایک وضاحتی انداز اختیار کیا ہے۔ (۵) طرفہ ستم یہ کہ غیر ترقی پسند نقادوں نے تو اس کے خلاف لکھا، ترقی پسندوں نے بھی فیض کے اس جمالیاتی اسلوب کو رد کر دیا۔ بعضوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ فیض چوں کہ طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں ترقی پسندی کا اظہار کھل کر نہیں ہوا۔ ان کے اعتراضات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ فیض نے زندگی کی کرخت حقیقتوں کو کرخت شکل میں پیش

کرنے کے بجائے ریشمی پردوں میں لپیٹ دیا ہے اور زندگی کی کرختگی اور کھردرے پن کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اب کیا کیا جائے کہ فیض ترقی پسندی اور نئی حقیقت نگاری سے ذہنی مطابقت رکھنے کے باوجود ایک جمالیاتی احساس رکھنے والے شاعر تھے۔ انھوں نے اس حقیقت نگاری کا اظہار بھی اپنے مخصوص مزاج اور تخلیقی شخصیت کے حوالے سے کیا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کا لہجہ دھیما پن لیے ہوئے ہے لیکن وہ اسی دھیمے دھیمے انداز سے قاری کے جذبات میں اتھل پتھل پیدا کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کچھ ان ہی کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس فکر کو انھوں نے جس تخلیقی توانائی سے پیش کیا ہے، کم ہی کسی ترقی پسند شاعر کو نصیب ہوا ہے۔ بلیغ استعاروں کے باوجود عوامی سطح پر بھی ان کی شاعری کو پذیرائی ملی۔ وہ نہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ ذوق شعر کے حامل قاری کو متاثر کرتے ہیں بلکہ عام قاری بھی ان سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میر صاحب کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے:

> شعر میرے ہیں گو خواص پسند
> پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس بات کو خلیل الرحمٰن اعظمی شاعر کی تخلیقی شخصیت اور سماجی شعور کی اکائی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ شعور زندگی کے حقائق تک رسائی حاصل کر لینے یا سیاسی و سماجی مسائل کو اہم سمجھ لینے پر ہی منحصر نہیں۔۔۔ انھوں (فیض) نے اپنی شخصیت کے تمام عناصر میں ایک مرکزیت بھی پیدا کی ہے۔ (۶)

''چند روز اور مری جان'' جو پہلے ''تسلی'' کے عنوان سے شائع ہوئی، اسی امتزاجی اسلوب کی نظموں میں رجائی انداز نظر کی وجہ سے منفرد ہے۔ یہاں پہلی دفعہ شاعر ایک روشن مستقبل کی نوید سناتا ہے لیکن اس سلسلے کی نظموں میں ''موضوعِ سخن'' اور ''دو عشق'' اس فکر اور اسلوب کی

شاہ کار نظمیں ہیں۔ یہاں فیض نے رومان اور انقلاب یا عشق اور زندگی کے اس تضاد کو حل کر دیا ہے جو ان کی پہلی نظموں میں نظر آتا ہے۔ اور جن پر اعتراضات کا ایک انبار ناقدین ادب نے لگا دیا تھا۔ اگر چہ ڈاکٹر آفتاب احمد اور جابر علی سیّد نے ''موضوعِ سخن'' کے دونوں حصوں کے آخری شعروں کو اردو کے رومانوی شاعروں پر طنز قرار دیا ہے (۷) لیکن اس کے باوجود یہ شعر فیض کے مجموعی نظریۂ شعر سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ''دو عشق'' اس حوالے سے زیادہ مکمل، جامع اور فکری وضاحت کی حامل ہے۔ فیض نے اس نظم میں ہچکچاہٹ کے بغیر زندگی کے جمالی اور جلالی دونوں پہلوؤں کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ انھیں زندگی کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے تمام معترضین سے بے پروا نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انھوں نے ان نکتہ چینوں کی کج فہمی کو جان لیا ہے اور ان سے بے پروا ہو کر اپنی تخلیقی دنیا میں محو ہو گئے ہیں۔ رومانیت سے انقلاب اور پھر انقلاب کے جمالیاتی شعور تک فیض کے اس سفر کو پروفیسر قمر رئیس اپنے مضمون ''فیض کی غزل کا اسلوب و آہنگ'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

> نقش فریادی کی شاعری میں بھی فیض تنہائی اور نسوانی حسن کی پرستش کے اسی دور سے گزرے ہیں لیکن جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ اصل زندگی ایک کڑا درد ہے جو گیت میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فیض کے سماجی شعور و آگہی نے انھیں دکھی، مظلوم اور کراہتی ہوئی انسانیت سے ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا اور اب ان کی شاعری میں فطرت کی جگہ دبے کچلے محکوم انسانوں اور ان کی بے خوابی کے خوابوں نے لے لی۔ اس طرح ان کی رومانی حسیت انقلابی احساس و فکر کے سانچے میں ڈھل گئی۔ (۸)

دست صبا اور زندان نامہ کی بیش تر نظمیں ان کے اس دور کی یادگار ہیں جو انھوں نے راول پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں قید میں گزارا۔ ان مجموعوں میں فیض کی آواز انقلابی توانائی سے معمور ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قید نے ان کے انقلابی احساس کو مہمیز کر دیا ہو۔ وہ غالب کے اس شعر کی تصویر نظر آتے ہیں:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

فیض نے دست صبا کے دیباچے میں لکھا تھا:

> شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دست رس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ---- اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔ (۹)

فیض نے اپنی شاعری اور زندگی میں یہ تینوں کام عملی طور پر کر دکھائے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف جنگ میں اپنا کردار ادا کیا، صحافت کے حوالے سے قلم کی لڑائی لڑی، پنڈی سازش کیس کے حوالے سے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں اور جریدہ لوٹس (Lotus) کے مدیر کی حیثیت سے بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے عملی جدوجہد کی۔ ان کی زندگی کی ان سرگرمیوں کا عکس ان کی شاعری پر براہِ راست دیکھا جا سکتا ہے۔ قید کے دنوں کی شاعری میں ایک باغیانہ طمطراق اور ایک انقلابی شان نظر آتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ظاہری مصائب نے ان میں زندگی کی حرارت کو دو چند کر دیا ہے۔ یہ حوصلہ مندی ایک سچے انسان اور کھرے انقلابی میں ہی ہو سکتی ہے ورگرنہ ہمارے ہاں تو مشکلات پریشانی اور پشیمانی کا شکار کر دیتی ہیں۔

فیض صاحب کے شعری اسلوب اور فکر میں وقت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور پختگی ایک ارتقائی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلیں، قطعات اور چھوٹی بڑی بے شمار نظمیں اس پختگی کا مظہر ہیں۔ یہاں ہم ان کی چند شاہ کار نظموں کے حوالے سے بات کریں گے جن کی ستائش ہر نقاد نے بہ قدر حوصلہ وظرف کی ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ''دو عشق'' میں ان کے ہاں جو دو

ٹوک رویہ نظر آتا ہے، بعد کی شاعری میں ان کی یہ فکر اور بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ ان کی نظم ''ملاقات'' کو ہر نقاد نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم اپنی بنت، امیجری اور جدید حسیت کے حوالے سے اردو کی شاہ کار نظموں میں شمار ہو سکتی ہے۔ یہاں انھوں نے انقلاب کو myth بنا دیا ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں وہ رات کی عظمت، بے کرانی اور سحر کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ اس سحر کے اسیر نہیں ہوتے بل کہ اس کو ختم کرنے کا اسم دریافت کرتے ہیں:

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

سجاد ظہیر نے ان چار مصرعوں کو فیض کا اپنے خاص رنگ شعر سے گریز قرار دیا ہے۔ یہ مصرعے نہ صرف یہ کہ نظم کی موضوعاتی بنت میں گریز کا کام دے رہے ہیں بلکہ فیض کے شعری تجربے میں بھی ایک اضافہ ہیں۔ فیض کی یہ نظم مایوسیوں میں امید کی کرن ہے، درِ ناامیدی بند کرتی ہے اور ایک نئے جہاں کی طرف ایک روشن مستقبل کی طرف در وا کرتی ہے۔ یہ نظم بجھے ہوئے دلوں میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے، زندگی میں آنے والی رکاوٹوں، مصیبتوں، بلاؤں اور آلام کو ایک نئی صبح کا مژدہ قرار دیتی ہے:

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

عظیم رات سے عظیم تر صبح کا خواب ہی فیض کی شاعری کا بنیادی نکتہ ہے۔ اسی نظم کے بارے میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> فیض کی نظم ملاقات مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرصع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوب صورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔(۱۰)

اس نظم میں جوانی کی جذباتیت اور ابتدائی انقلابی تندی کے بجائے ایک وقار اور تخلیقی رچاؤ نظر آتا ہے۔ اپنے آدرش پر یقینِ محکم کا ایک ایسا احساس ملتا ہے جو زندگی پر ایمان اور نظریے سے وابستگی کو مضبوط کرتا ہے۔ اب کوئی ابہام باقی نہیں رہا—— کوئی بے یقینی یا ناامیدی باقی نہیں رہی۔ اس نظم کا لہجہ بھی اپنے اندر وہ تمکنت لیے ہوئے ہے جو اعلیٰ فن کا خاصا ہے۔ ''ملاقات'' کے علاوہ بھی فیض صاحب کی اور نظموں مثلاً ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' (زنداں نامہ)، ''شام'' (دست تہِ سنگ) ''یہاں سے شہر کو دیکھو'' (سروادیٔ سینا) اور ''یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے'' (مرے دل مرے مسافر) میں ان کی فن کاری کا یہی انداز ملتا ہے۔

رومانویت سے حقیقت نگاری کے سفر اور حقیقت نگاری کے مختلف زاویوں کے انکشاف کو جس طرح فیض احمد فیض نے تخلیقی رچاؤ سے پیش کیا ہے، ان کے عہد کے کم ہی شاعروں کو نصیب ہوا ہے، خاص طور پر ترقی پسند حقیقت نگاری کا جیسا تخلیقی اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے، دوسرے ترقی پسند شاعروں کے حصے میں نہیں آیا، اس لیے نظریاتی تحرک کے حوالے سے ہم فیض کو عظیم ترقی پسند شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کا برملا اعتراف معتدل اور متوازن فکر رکھنے والے تمام نقادوں نے کیا ہے۔ ان کے فکر و فن کے ارتقائی مراحل کو حرفِ آخر سمجھ کر حتمی لہجے میں ان کی شاعری کو رد کرنے والے نقادوں نے کسی بھی طرح ادب کی تفہیم کا فریضہ سرانجام نہیں دیا۔ شاعر

کواس کے ارتقا کے کسی ایک مرحلے میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کی تفہیم اس کی شاعری کے کلی مطالعہ سے ہی ممکن ہے وگرنہ اقبال ہوں، راشد ہوں یا فیض، اپنی ابتدائی تخلیقات میں اس درجے کے شاعر نظر نہیں آتے جوان کے فن کے کلی جائزے کے بعد متعین ہوتا ہے۔

حوالہ جات

* ڈاکٹر ضیاء الحسن، استاد، شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

(۱) فتح محمد ملک، تعصبات (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۱ء)، ۲۵۴۔

(۲) سلیم احمد، نئی نظم اور پورا آدمی (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)، ۷۱-۷۰۔

(۳) آفتاب احمد خان، فیض احمد فیض --- شاعر اور شخص (کراچی: دانیال، ۲۰۰۴ء)، ۳۸-۳۷۔

(۴) جمیل جالبی، ''نئے شاعر --- فیض'' ماہ نو ر لاہور (بیادِ فیض)، ۵۔۶۱ (۲۰۰۸ء): ۲۸۰۔

(۵) سجاد حارث، ادب اور ریڈیکل جدیدیت (لاہور: نگارشات، ۱۹۸۸ء)، ۷۶۔

(۶) خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ۱۳۸۔

(۷) جابر علی سیّد، تنقید و تحقیق (ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۷ء)، ۳۳۔

(۸) قمر رئیس، معاصر اُردو غزل (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ۱۱۲۔

(۹) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (لاہور: مکتبہ کارواں، س ن)، ۱۰۳۔

(۱۰) عبدالرؤف، فیض کی شاعری کا نیا دور (لاہور: پیپلز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء)، ۱۲۸۔

کتابیات

احمد، سلیم۔ نئی نظم اور پورا آدمی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء۔

اعظمی، خلیل الرحمٰن۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۲ء۔

جالبی، جمیل۔ ''نئے شاعر --- فیض۔'' ماہ نو ر لاہور (بیادِ فیض)۔ ۵۔۶۱ (۲۰۰۸ء)۔

حارث، سجاد۔ ادب اور ریڈیکل جدیدیت۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۸۸ء۔

خان، آفتاب احمد۔ فیض احمد فیض --- شاعر اور شخص۔ کراچی: دانیال، ۲۰۰۴ء۔

رئیس، قمر۔ معاصر اُردو غزل۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء۔

سید، جابر علی۔ تنقید و تحقیق۔ ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۸۷ء۔

عبدالرؤف۔ فیض کی شاعری کا نیا دور۔ لاہور: پیپلز پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء۔

فیض، فیض احمد۔ نسخہ ہائے وفا۔ لاہور: مکتبہ کارواں، س ن۔

ملک، فتح محمد۔ تعصبات۔ لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۱ء۔